احمد ندیم قاسمی

ہم اجنبی ہیں

''ہم اجنبی ہیں'' کے آغاز میں اشفاق حسین نے اپنی شاعری اور اپنی سوچوں کا تذکرہ اتنی سچائی اور بے تکلفی سے کیا ہے کہ اس کے فن کے بارے میں کسی ابہام یا کسی استفہام کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس نے صاف اور غیر مبہم لفظوں میں اپنی شاعری کے قارئین کو بتایا ہے کہ اجنبی دیاروں میں اس کے بنیادی مسائل ہیں: ہجرت اور غریب الوطنی، شناخت اور تشخص، تنہائی اور اجنبیت، رزق اور معاش۔

اشفاق حسین کی اس مختصر مگر جامع تحریر میں اس کے فن کے سبھی پس منظر اور پیش منظر بیان ہو گئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس تحریر کی غیر موجودگی میں دوسروں کو کہنا پڑتا۔ ظاہر ہے موجودہ صورت مں کم سے کم مجھے تو اشفاق حسین کے اشاروں کی طرف ہی اشارے کرنے ہیں کہ اس نے ہم ایسوں کے کہنے کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ اس نے خود کہا ہے کہ میں نے کچھ چھپایا نہیں اور ویسے چھپاتا بھی کیا اور کیوں چھپاتا؟

یہ سارے مسئلے روزگار اور معاش کے سلسلے میں ہجرت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہجرت ہی سے بے تشخصی، بے چہرگی اور تنہائی نے جنم لیا ہے۔ ہجرت کی یہ کیفیت اتنی شدید ہے کہ اشفاق کو اُس سورج تک پر شبہ ہوتا ہے جو اس کے ہجرت کدے میں طلوع ہوتا ہے۔

یہ لوگ کون سے سورج کی بات کرتے ہیں؟
میں جس زمین پہ ہوں اس پہ آسماں بھی نہیں

مایوسی اور بے بسی کے اس عالم میں پتھر سے سر ٹکرانے کو جی چاہتا ہے تو یہ جذباتی المیہ بھی درپیش

ہوتا ہے کہ پتھر تو بہت سے ہیں مگر کوئی پتھر اپنا پتھر نہیں ہے اور ساتھ ہی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ
:

سمندر چھوڑ آئے کوہ و دریا چھوڑ آئے ہیں
نئی دنیا کی خاطر ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
پہن کر ہم لباسِ اجنبیت کس طرف جائیں؟
کہ ہم اپنا بدن لائے ہیں چہرہ چھوڑ آئے ہیں

یہ چہرہ اپنے تشخص اور اپنی شناخت کا ہے اور اجنبی دیاروں میں اپنا تشخص اور اپنی شناخت پیدا کرنا کارے دارد ہے کہ:

اجنبی دیس میں
اپنی پہچان کی بے کفن لاش اٹھائے
ہم جو آئے
ہمیں دیکھ کر
لوگ بے ساختہ مسکرائے

اسی کرب کی گرفت میں شاعر سوچتا ہے:

نہ جانے کب وہ دن آئے گا
جب ہم خود کو جانیں گے

جب انسان اپنے آپ سے بچھڑ جاتا ہے تو لاکھوں کروڑوں کی موجودگی میں بھی تنہائی اور اجنبیت کی گرفت سے رہائی نہیں پا سکتا۔ اسی لیے تو اشفاق کے ہاں ایسے شعر اور مصرعے بار بار وارد ہوتے ہیں:

اک غول پرندوں کا ہے اور شام کا منظر
ایسے میں خیال آیا کوئی گھر نہیں اپنا

پھر خود کو ذرا سا تھپک لینے کی کیفیت بھی موجود ہے:

پلٹ کے آئیں بھی کیا زندگی سے کیا مانگیں
اُداس شہر کی تیرہ شبی سے کیا مانگیں
وہ اجنبی ہی سہی سر پہ سائبان تو ہے
اب اور اس کے سوا بے گھری سے کیا مانگیں

اب کوئی ہجر کا نغمہ نہ زباں تک آئے
ہے یہ سب اپنی زمیں ، پاؤں جہاں تک آئے

اس نیم دلانا کوشش کے باوجود تنہائی اور بے چہرگی کے المیے کا خول نہیں ٹوٹتا کہ یہ انسانی فطرت ہی کے خلاف ہے۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں تو ''دوزخ کی سب کالیں لوکل کالیں ہیں'' اور

لوگ اُس دیس ک یوں سوئے ہیں اشفاق کہ اب
کوئی طوفاں ہی جگائے گا بغاوت کے لیے

مگر اس درد و کرب کے عالم میں بھی اشفاق حسین کے ہاں حوصلہ مندی کی صلاحیت موجود ہے:

یہ دنیا کس قدر پیچیدہ ہے
ہم اس کے سارے پیچ خود پر منکشف کر لیں
یہ ناممکن ہے

لیکن یہ تو ممکن ہے

کہ ہم اپنے حوالوں سے

اسی دنیا کے رنگیں کینوس پر

اپنی اپنی خواہشوں کے رنگ بھر جائیں

اور انسان پر انتہا درجے کی مایوسی صرف اس وقت حملہ آور ہوتی ہے جب خواہشیں، آرزوئیں اور امیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اشفاق کے ہاں تو ان کی بے حد فراوانی ہے:

ہم رنجیدہ ہیں

ہم غم زدہ ہیں

اور ہمارے رنج و غم کے پیڑ کی سب کونپلیں

ہمارے ہی بدن سے پھوٹتی ہیں

ہمیں یہ کونپلیں پیاری ہیں

اپنے رنج و غم پیارے ہیں

یہ سب اپنے جینے کے سہارے ہیں

اشفاق حسین نے اپنے آپ کو ان موضوعات و مسائل کے بحرِ ذخار میں ڈبو نہیں دیا بلکہ وہ اس عالم میں بھی مشاہدات و محسوسات کے اعجاز دکھانے پر قادر رہا ہے۔ شعور و وجدان کے مثبت رشتے کو اس نے کتنی خوب صورتی سے واضح کیا ہے:

خواب کے بے در گنبد میں جانے سے پہلے

اپنے لیے واپس آنے کا رستہ رکھنا

پاکستان میں عورت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ بھی اس کی باریک بینی سے پوشیدہ نہیں رہا:

عورت اور ہل کو ابھی ایک سمجھنے والے
کیسے جانیں ایک دھڑکتے دل کے احساسات
ہو تو رہا ہے آدھی گواہی پورے جسم کا کھیل
اب دیکھیں گے ہوتی ہے اس کھیل میں کس کو مات

لوگ نئی نسل کو منہ زور اور منہ پھٹ قرار دینے سے نہیں چوکتے مگر اشفاق کا نقطۂ نظر خالصتاً حقیقت پسندانہ ہے:

ہیں ان کے ذہن تو چھوٹے مگر خیال بڑے
ہمارے بچّے ہیں ہم سے ہزاروں سال بڑے
کھلی ہوا جو ملی ہے تو کم سنی میں بھی
ابھر کے آنے لگے ذہن میں سوال بڑے

اشفاق اپنی نظم ''بیٹے کے نام'' میں نئی نسل کی نئی سن سی بیلٹی کا نہایت فراخ دلی سے خیر مقدم کر رہا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس نظم میں اس نے اپنے بیٹے کو اپنا ہمزاد بنا کر پیش کیا ہے اور آنے والے دور کے بے پناہ امکانات کو کھلی بانہوں کے ساتھ خوش آمدید کہا ہے۔ اس طرح کے خیالات کسی باشعور اور انسانی رسائیوں پر ایمان رکھنے والے شخص ہی کے ہو سکتے ہیں اور اشفاق کا مزاج ان صفات سے پوری طرح مزیّن اور مسلح ہے۔

آخر میں اشفاق کی غزلوں کے دل میں اتر جانے والے دو چار اشعار سنیے۔ ان میں سے پہلے دو

اشعار میں فراق کے لہجے کی گونج صاف سنائی دے رہی ہے اور یہ نہایت اچھی روایت ہے کہ اگر چراغ سے چراغ جلانے کا سلسلہ بند ہو جائے تو شعر و ادب، ظلمات کے حوالے ہو جائیں۔ وہ کہتا ہے:

کوئی دستک سی دیے جاتا ہے اک وہم سا ہے
کان میں گونج رہا ہے کوئی لہجہ اب تک

یاد وہ آیا بچھڑ کر جس قدر
اتنا میں نے اس کو چاہا بھی نہیں

نہ جانے اُس نے کس لہجے میں مجھ سے گفتگو کی ہے
زباں آتی ہے تو ہے لیکن مجھے مطلب نہیں آتا

اور آخر میں اسی خاندان کا ایک اور دل گداز اور موثر شعر:

کمالِ ضبط کی حد پر ہوں میں بھی
مگر دریا تو رستہ مانگتا ہے

اس مختصر وقت میں اشفاق حسین کے امکانات بھرے فن شعر کے علاوہ میں چاہتا تھا کہ اس کی دیگر تصانیف 'فیض ایک جائزہ' شعری مجموعہ 'اعتبار' اور تازہ ترین تصانیف 'فیض کے مغربی حوالے' اور 'فیض حبیبِ عنبر دست' کے بارے میں کچھ عرض کروں مگر یہ کام کسی دوسری صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں اور اشفاق حسین کے تازہ شعری مجموعے 'ہم اجنبی ہیں' کی اشاعت پر میں اشفاق سے زیادہ اردو شاعری کے مستقبل کی خدمت میں تہنیت پیش کرتا ہوں۔

(آرٹس کونسل کراچی میں اشفاق حسین کے دوسرے شعری مجموعے 'ہم اجنبی ہیں' کی رسم اجرا کے موقعے پر پڑھا گیا-۱۹۹۳)